منوّر ابنِ صادق

اقبال کا نظریۂ قومیت

07

ہمارے ملک میں قوم اور قومیت کے الفاظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ کبھی انہیں ذات (CASTE) کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی انگریزی الفاظ نیشنیلٹی، نیشن ہڈ اور نیشنلزم کے بجائے استعمال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اصطلاحی اعتبار سے ان میں ہر لفظ کا مفہوم جدا ہے۔ ذات حسب نسب پر مبنی حالت (STATUS) ہے۔ نیشنیلٹی (NATIONALITY) سے مراد کسی ملک کی شہریت (CITIZENSHIP) ہے اور نیشن سے مراد افراد کا ایسا مجموعہ ہے جس میں شعوری طور پر فکری وحدت کا احساس موجود ہو اور دراصل یہی وہ اصطلاحی مفہوم ہے جس کے لیے قوم کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس مقالے میں یہی مفہوم پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے قومیت سے مراد وہ تصور ہے جس کی بنا پر افراد کے کسی گروہ میں فکری وحدت کا شعور موجود ہوتا ہے۔ فرانسیسی مستشرق رینان (RENAN) کا قول ہے کہ ”انسان نہ تو نسل کی قید گوارا کر سکتا ہے نہ مذہب کی، نہ دریاؤں کا بہاؤ اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے، نہ پہاڑ کی سمتیں اس کے دائرے کو محدود کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح الدماغ انسانوں کا ایک زبردست اجتماع موجود ہے اور ان کے دلوں میں جذبات کی گرمی ہے تو انہی کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جائے گا جسے ہم لفظ قوم سے تعبیر کرتے ہیں“۔ [1]

قومیت کی اساس

قومیت کے مفہوم کو سامنے رکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ قومیت کی تشکیل کے لیے متعلقہ گروہِ افراد میں فکری

---

[1] بحوالہ رضیہ فرحت بانو، خطباتِ اقبال، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، دسمبر ۱۹۶۴ء، ص ۲۳

وحدت کا شعور اساسی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس امر میں اختلاف آرار ہے کہ یہ شعور کس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جدید مغربی مفکرین نے اس سلسلے میں وطن، نسل، رنگ، زبان وغیرہ کے اشتراک کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مغربی دنیا میں کلیسا (مذہب) کو اساس وحدت قرار دیا گیا تھا اور اس کی بنا پر مغرب میں ایک وسیع کلیسائی حکومت بھی قائم کی گئی لیکن خود اس اساس میں خرابی کی صورت مضمر تھی۔ کیونکہ مغرب میں مسیحیت کا دور دورہ تھا اور مسیحیت ایک رہبانی مذہب ہے جس کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے اور کسی اجتماعی نظام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس اعتبار سے مذہب مسیحیت تشکیلِ قومیت یا تشکیلِ ریاست جیسے اجتماعی معاملات میں اساس کا کام نہ دے سکتا تھا۔ لہٰذا پندرھویں صدی عیسوی میں قومی اور سیاسی امور میں مذہب کے اساسی تصور کے خلاف ردعمل شروع ہوا اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس ردِعمل کا سب سے ممتاز علمبردار ایک مذہبی شخص مشہور مسیحی پادری مارٹن لوتھر تھا۔ مسیحیت کے خلاف اس ردعمل کا علامہ اقبال نے اس طرح ذکر کیا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی سماتی کہاں اس فقیری میں میری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

دین و دولت یعنی مذہب و سیاست کی علیحدگی کی تحریک بنیادی طور سے مادہ پرستانہ تحریک تھی۔ اس تحریک نے وحدت مغرب کی مذہبی اساس ختم کر دی اور اس کے بجائے خالص مادی اور محسوس اساس کو تشکیلِ قومیت کا ذریعہ بنایا۔ وطن، نسل اور زبان اسی متبادل اساس کے مختلف مظاہر ہیں۔ اب یہ مظاہر چونکہ مختلف افراد اور علاقوں میں مختلف روپ رکھتے ہیں۔ لہٰذا مسیحی مغرب کے لیے قومیت کی اساس ایک کے بجائے متعدد و متفرق ہو گئی اور اس کی وجہ سے مغرب کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ بقول اقبالؒ

؎ حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز[1] 08

اسلامی نقطۂ نظر سے رنگ، زبان، نسل اور وطن سب عارضی اور اضافی امتیازات ہیں لہٰذا ان میں سے کوئی بھی قومیت جیسے مضبوط جذبے کی اساس کا کام نہیں دے سکتا۔ اسلامی نقطہ نظر سے قومیت کی اصل اساس زندگی کے بارے

---

[1] علامہ اقبال، بانگ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، مئی ۱۹۹۹ء، ص ۲۰۰

میں نقطۂ نظر ہے جہاں اس بنیادی نقطۂ نظر میں اختلاف واقع ہوگا، قومیت بدل جائے گی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں واضح طور سے ارشاد فرمایا گیا ہے:

کان الناس امۃً واحدۃً قف فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین ص وانزل معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ ط وما اختلف فیہ الا الذین اوتوہ من بعد ما جاءتھم البینات بغیاً بینھم ج فھدی اللہ الذین آمنوا لما اختلفوا فیہ من الحق باذنہ ط واللہ یھدی من یشاءُ الی صراط مستقیم ۝ [1]

(یعنی) سب لوگ ایک قوم تھے پھر اللہ تعالیٰ نے انبیا بھیجے، بشارتیں دینے والے اور (عذاب الٰہی سے) متنبہ کرنے والے اور ان کے ہمراہ برحق کتابیں نازل کیں تاکہ لوگوں کے درمیان ان امور کا فیصلہ کر دے جن میں کہ انہوں نے اختلاف کیا اور جن لوگوں کو (علم کتاب) عطا کیا گیا انہی نے واضح دلائل آنے کے بعد سرکشی کی وجہ سے اختلاف کرنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اپنے اذن سے امر حق کے ان پہلوؤں کے متعلق واضح راہ دکھا دی جن کے متعلق ان میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔

09

اس طویل آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اوّل اوّل تمام بنی نوع انسان ایک قوم تھے۔ ان میں اختلاف رونما ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے مابین فیصلے کے لیے انبیا مبعوث فرمائے۔ جن لوگوں نے انبیاء کا فیصلہ تسلیم کیا وہ ایک قوم بن گئے اور جنہوں نے اس سے روگردانی کی وہ ایک علیحدہ قوم بن گئے۔ دراصل نوع انسانی میں قومیت کی تقسیم کی یہی بنیاد ہے جو آج تک چلی آ رہی ہے۔ اسی بنا پر تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، کالے ہوں یا گورے، عربی، فارسی اور اردو بولتے ہوں یا انگریزی، لاطینی اور جاپانی۔ سرائیکی بولتے ہوں یا ہریانی۔ اسی طرح تمام کافر دراصل ایک ملت واحدہ ہیں خواہ وہ کسی رنگ، نسل، زبان یا علاقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اسی بنا پر میں دور حاضر میں وضع کی گئی اصطلاح "تیسری دنیا" کو درست نہیں سمجھتا۔ کیونکہ یہ بنی نوع انسان کو دو کے بجائے تین اقوام میں تقسیم کرتی ہے۔ یعنی سرمایہ پرست قوم (CAPITALIST WORLD)، اشتراکی قوم (COMMUNIST WORLD) اور مسلمان قوم (MUSLIM WORLD)۔ دراصل پوری دُنیا ۲ چھوٹی دنیاؤں (SUB-WORLDS) میں منقسم ہے اور وہ ہیں مسلم ورلڈ اور نان مسلم ورلڈ اور بس۔

---

[1] القرآن، سورۃ البقرہ ۲: ۲۱۳

قرآن حکیم میں قوم کا لفظ اس پورے گروہِ افراد کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جس کی طرف کسی نبی کو بھیجا گیا۔ اس میں سے بعض افراد نے نبی اللہ کی دعوت کو قبول کیا اور بعض نے اس سے روگردانی کی لیکن نبی اللہ اپنی تبلیغ کے دوران پورے گروہ کو "یا قوم" کہہ کر خطاب کرتا رہا۔ اس سے بظاہر مسلم، غیر مسلم متحدہ قومیت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ در اصل ہر نبی کی قوم کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ گروہ افراد جس کی طرف نبی کو بھیجا گیا اور دوسرا وہ گروہ جس نے نبی کی دعوت کو قبول کیا۔ پہلی قوم کو اس نبی کی امتِ دعوت اور دوسری کو امتِ اجابت کہتے ہیں اور اتمامِ تبلیغ کے بعد دراصل امت اجابت ہی نبی کی قوم کہلاتی ہے۔ نبی آخر الزماں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بھی یہی ہے۔ آنحضورؐ پورے عالم کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے اور آپ کی نبوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے اور یوں قیامت تک کے لیے پوری نوعِ انسانی حضورؐ کی امتِ دعوت میں شامل ہوگی۔ لیکن حضورؐ کی امت اجابت میں صرف وہی لوگ شامل ہوں گے جو اس امت دعوت میں سے حضورؐ کی دعوتِ خیر کو قبول کر لیں۔ اس قاعدے سے بھی میرے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ پوری دنیا فی الاصل دو ہی قوموں میں منقسم ہے۔ اہل اسلام نبی کی دعوت قبول کرنے کی بنا پر علیحدہ قوم ہیں اور اہل کفر الگ قوم!

قرآن حکیم میں شعوب وقبائل (برادریوں اور قبیلوں) کا ذکر موجود ہے لیکن یہ تقسیم محض جان پہچان کے لیے ہے۔ جیسے افراد کے نام رکھ لیے جاتے ہیں تاکہ شناخت ہو سکے[1]۔ اسی طرح رنگوں اور زبانوں کی اہمیت کا اعتراف بھی قرآنِ حکیم میں موجود ہے لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان رنگوں اور زبانوں کے اختلاف اور تنوع سے اللہ کی قوتِ تخلیق پر غور کرے کہ ایک ہی نسل سے اللہ تعالیٰ نے کتنے مختلف رنگ اور کتنی مختلف زبانیں بنائیں[2]۔ اس کے علاوہ رنگ، زبان اور نسل کی اور کچھ اہمیت نہیں۔ یہ امتیازات محض اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی بنا پر کسی قومیت کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے لیے ایسا عنصر درکار ہوتا ہے جو مستقل ہو اور قومیت کے مستحکم جذبے کی بنیاد بن سکے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ عنصر دین ہے اور اس کی بنا پر تمام مسلمان ایک قوم ہیں۔

اصولی طور سے تمام اہل کفر بھی ایک قوم ہیں۔ لیکن جس طرح سیدھا خط صرف ایک ہی ہو سکتا ہے جبکہ ٹیڑھے خطوط متعدد ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اہل کفر میں بھی مزید تفریق کے امکانات موجود ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اہل کفر نے رنگ، نسل، زبان اور علاقے کو بنائے تفریق بنایا اور قوم در قوم تقسیم ہو چکے ہیں تاہم ایسے مواقع

---

[1] القرآن، سورۃ الحجرات ۴۹ : ۱۳

[2] القرآن، سورۃ الروم ۳۰ : ۲۲

آتے رہتے ہیں جب ان تمام اہل کفر کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ دراصل ایک قوم ہیں اور وہ اہل اسلام کے مقابلے میں اپنے اضافی اختلافات سے قطع نظر کر کے ایک قوم بن جاتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جو اہل اسلام کے لیے لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

11 برصغیر میں تصورِ قومیت کا مسئلہ

علامہ اقبال کا زمانہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا انتہائی پُر آشوب دور تھا۔ ان کی زندگی کی آخری دہائی برصغیر کی سیاسی کش مکش کے سلسلے میں خاص طور سے نمایاں ہے۔ قومیت کا مسئلہ اس زمانے کے بنیادی موضوعاتِ بحث میں سے تھا۔ علامہ اقبال نے اس بحث میں براہ راست حصہ لیا اور اس مسئلے پر برصغیر کی رائے عامہ پر گہرا اثر ڈالا۔ بعض اقبالی اس بات کے قائل ہیں کہ علامہ موصوف نے رائے عامہ کو متاثر نہیں کیا بلکہ خود اس سے متاثر ہو کر اپنا تصورِ قومیت بدل لیا۔ علامہ کا تصورِ قومیت کیا تھا اور انہوں نے اسے کس طرح بدلا، یہ بحث آگے آ رہی ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ برصغیر میں تصورِ قومیت کا مسئلہ تھا کیا؟

بظاہر تصورِ قومیت کا سوال برصغیر میں بیسویں صدی کی پیداوار ہے اور ۱۹۳۰ء سے قبل اس کے سیاسی مضمرات کو کبھی پوری طرح محسوس نہ کیا گیا لیکن دراصل یہ مسئلہ برصغیر میں مسلمانوں کے ورود ہی کے وقت سے سامنے آ گیا تھا۔ مسلمانوں کے ورودِ ہند کے وقت یہ برصغیر چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں بٹا ہوا تھا لیکن ان سب میں ہندومت قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر کی تاریخ کے ہر اہم موڑ پر اکثر ہندو راجے برصغیر کو ایک "غیر قوم" کی یلغار سے بچانے کے لیے ایک ہی جھنڈے تلے جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کا سب سے نمایاں مظاہرہ اس وقت ہوا جب ہندوستان کو مسلمان بابر سے بچانے کے لیے ہندو رانا سانگا نے ہندوستان کے تمام راجوں کی مجموعی قوت کو کنواہہ کے میدان میں جھونک دیا تھا۔ اس اہم موڑ پر ہندوؤں کی ناکامی کے بعد مسلمان قوم مزید ساڑھے تین سو سال تک اس برصغیر پر حکمران رہی لیکن اس طویل دور میں ہندو مسلمانوں کو اور مسلمان ہندوؤں کو علیحدہ قوم سمجھتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کا نظریۂ حیات، دونوں کا ضابطۂ حیات، دونوں کا نظامِ حیات، دونوں کا دین ــ جدا جدا تھا۔ مغل شہنشاہ اکبر نے اس امتیاز کو ختم کرنے کی کوشش کی اور "رام اور رحیم" کو یکجا کر کے برصغیر کے باسیوں کو "متحدہ قومیت" کے خود ساختہ بندھن میں جکڑنا چاہا لیکن دونوں قوموں نے ــ مسلمانوں نے ہی نہیں ہندوؤں نے بھی، اکبر کے مقرب ہندو راجوں تک نے ــ شہنشاہ کے آرڈی ننس کے ذریعے پیدا کردہ "تصورِ قومیت" کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

علامہ مرحوم کے زمانے میں آل انڈیا کانگریس متحدہ قومیت کی علمبردار تھی اور اس کا نعرہ، اس کا سلوگن تھا کہ برصغیر کے تمام باشندے اشتراک وطن کی وجہ سے ایک قوم ہیں۔ دوسری طرف آل انڈیا مسلم لیگ تھی جو مسلمانوں کے جداگانہ احساسِ قومیت سے وجود میں آئی تھی۔ اس کا موقف یہ تھا کہ مسلمان اپنی جداگانہ تہذیب و تمدن کی وجہ سے ہندوؤں سے علیحدہ قوم ہیں۔ مسئلہ قومیت سے متعلق اس اختلاف رائے کی سیاسی اہمیت واضح ہے۔ متحدہ قومیت کے نظریے کا مطلب یہ تھا کہ برصغیر میں آزاد حکومت کے قیام کے لیے ہندو مسلم کی تفریق بے معنی ہے۔ جداگانہ قومیت کا واضح مطلب یہ تھا کہ مسلمان علیحدہ قوم ہیں اور برصغیر کی آزادی کی صورت میں حکومت خود اختیاری کے اصول کے مطابق انہیں اپنے لیے جدا نظامِ مملکت قائم کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔

علامہ اقبال کی مفکرانہ حیثیت

12

اس طویل تمہید کا مقصد یہ ہے کہ نظریۂ قومیت کے سلسلے میں اسلامی نظریۂ حیات کی روشنی میں معیار مقرر کر دیا جائے۔ اور اس دَور کی فکری فضا کی بھی نشاندہی کر دی جائے تاکہ علامہ اقبال کے نظریات کے جائزے میں اسے سامنے رکھا جا سکے۔ علامہ اقبال کی مفکرانہ حیثیت مسلم ہے۔ لیکن ان کی فکر کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اختلاف رائے موجود ہے۔ بعض لوگ انہیں قوم پرست شاعر قرار دیتے ہیں اور بعض آفاقی شاعر کہتے ہیں۔ کوئی انہیں رجعت پسند کہتا ہے کوئی اشتراکی۔ کوئی وطن پرست قرار دیتا ہے اور کوئی اسلام پرست، کوئی ان کے فکری تضاد کی نشاندہی کا دعویدار رہے۔ موضوع زیر بحث کے متعلق بھی علامہ کی فکر کی تعبیر میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ میں علامہ کی مفکرانہ حیثیت کا معترف ہوں لیکن ان کی فکر کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ منصب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہر غیر نبی انسان سے خواہ وہ کتنا ہی عظیم المرتبت ہو غلطی کا صدور ممکن ہے بہرحال اس مقالے میں موضوع زیر بحث کے متعلق علامہ کے تصورات کو بلا تصرف پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور علامہ کے فکری پس منظر اور اسلامی نقطہ نظر کی روشنی میں اس پر رائے زنی کی گئی ہے۔

فکرِ اقبال میں قومیت کا تصوّر

فکرِ اقبال میں تصور قومیت کے سلسلے میں اصل بحث یہی ہے کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قومیت کی اساس کیا تھی۔ علامہ رینان کے اس نظریے سے متفق ہیں کہ جذبہ قومیت دراصل کسی گروہ افراد میں مشترک

اخلاقی شعور کا نام ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے ریاست اور قومیت کا انحصار "اخلاقی نصب العین" پر ہے۔ وہی نصب العین اس کی اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور وہ شجر حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں۔[1] اس کے ساتھ ہی علامہ کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ یہ جذبہ محض عارضی اور ہنگامی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے زیر اثر جذبات اور احساسات کے انقلاب کے ساتھ ساتھ متعلقہ مجموعہ افراد کا عملاً زندگی کے نئے سانچے میں ڈھل جانا بھی ضروری ہے۔[2] اب اس مقصد کے لیے جو چیز اساس کا کام دے سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے ایک مستقل قدر (PERMANENT VALUE) ہونا چاہیئے۔ رینان نے مذہب تک کو اس کا اہل قرار نہیں دیا اور بات بھی درست ہے۔ مغرب میں مذہب کا جو محدود مفہوم رائج ہے اور جس کے زیر اثر مشرق والے بھی کہیں روحانیت کی آڑ میں، کہیں "دین کی محبت" کے نام پر اور کہیں کھلم کھلا اشتراکی ہتھکنڈوں کے ذریعے مذہب کو انفرادی معاملہ بنانے کے درپے ہیں۔ اس میں واقعی قومیت جیسے اجتماعی جذبے کے لیے مذہب کو اساس قرار دینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن علامہ مذہب کے اس محدود مفہوم کے قائل نہ تھے۔ ان کا مذہب، دین اسلام محض انفرادی معاملہ نہیں بلکہ زندگی کے انفرادی و اجتماعی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی تمام امور و معاملات پر حاوی ہے۔ چنانچہ یہاں رینان سے ان کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک جذبہ قومیت میں فقط مذہب ہی مستحکم اساس کا کام دے سکتا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء کے صدارتی خطبے میں انہوں نے اس تصور کی یوں نشاندہی کی ہے:-

13

> "سرزمین مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اہل مغرب بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن مذہب اسلام کی رُو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست، روح اور مادہ ایک ہی کُل کے اجزا ہیں"[3]

اس خطبے میں علامہ نے غیر مبہم الفاظ میں واضح کیا کہ مسلمانوں کے لیے صرف دین اسلام ہی جذبۂ قومیت کی اساس بن سکتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

---

[1] خطباتِ اقبال، ص ۴۰

[2] ایضاً ص ۲۳

[3] ایضاً ص ۲۲

"یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نظام اور نظام سیاست کے اسلام ہی سب سے بڑا جزو ترکیبی ہے۔ جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخ متاثر ہوئی اور اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات اور عواطف سے معمور ہوئے جن سے منفرق اور منتشر افراد بتدریج متمیز اور معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی جماعت اسلامی کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہینِ منت ہے۔"[1]

اپنے اسی تصور کو اپنی نظم "جواب شکوہ" میں علامہ نے بزبان خدا یوں بیان کیا ہے :۔

؎ قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں ![2]

ایک اور نظم "فردوس میں ایک مکالمہ" میں اسے یوں واضح کیا ہے ؎

مذہب سے ہم آہنگیٔ افراد ہے باقی
دین زخمہ ہے جمعیت ملت ہے اگر ساز
پانی نہ ملا زمزم ملّت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز[3]

14

علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد میں ہندوؤں کے متحدہ قومیت ہند کے تصور کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ "ان کے نزدیک لفظ قومیت کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے باہم اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان کے اندر کسی مخصوص ملت کا انفرادی وجود باقی نہ رہے۔ لیکن ہندوستان کی یہ حالت نہیں اور نہ اس کے ہم آرزومند ہیں۔ ہندوستان میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب موجود ہیں۔"[4] گویا علامہ کے نزدیک قوم و مذہب لازم و ملزوم ہیں۔ اسی بنیاد پر تعددِ اقوام کی وجہ سے علامہ موصوف ہندوستان کو "چھوٹا ایشیا" قرار دیتے تھے[5] اور اسی بنیاد پر جائنٹ کمیٹی آن انڈین کانسٹی ٹیوشنل ریفارمز کی رپورٹ ۳۴-۱۹۳۳ء میں تعددِ اقوام کے اعتبار سے برصغیر کو براعظم یورپ

---

[1] خطبات اقبال ، ص ۲۶، ۲۷
[2] بانگِ درا ، ص ۲۲۳
[3] بانگِ درا ، ص ۲۷۶، ۲۷۷
[4] خطباتِ اقبال ص ۴۱، ۴۲
[5] خطباتِ اقبال ، ص ۳۳۲،

کے مشابہ قرار دیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلاف کو تنگ مفہوم میں مذہبی نہیں بلکہ قانون اور کلچر کا اختلاف قرار دیا تھا اور دونوں کو دو مختلف تہذیبوں کی نمایندہ قرار دیا تھا۔[1] خود ہندو بھی اختلاف کی اس نوعیت کا بخوبی شعور رکھتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کے قومی تشخص کو ختم کر کے انہیں محکوم بنانے کے متحدہ قومیت کے مصنوعی تصور کا پرچار کر رہے تھے ورنہ انہیں مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود کا اعتراف تھا اور اس کی جھلک خود نہرو رپورٹ میں صاف نظر آتی ہے۔ جس کے واضعین کے صدر موتی لعل نہرو تھے۔[2] گاندھی جیسے متحدہ قومیت کے زبردست پرچارک کو بھی اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ ان کی تحریک کا بنیادی عنصر مذہب ہے۔[3]

15

علامہ اقبالؒ اپنے واضح تصورِ قومیت کی بنا پر یہ نظریہ رکھتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی زنجیر میں نہیں جکڑا جا سکتا۔ انہوں نے اکبر کے دین الٰہی اور کبیر کی بھگتی تحریک کے حوالے سے واضح کیا کہ ہندوستان کی متعدد قومیں اپنے انفرادی تشخص کو ختم کر کے ایک ہی قومیت میں ضم نہیں ہو سکتیں۔ علامہ کا یہ تجزیہ بالکل درست تھا۔ اکبر کی تحریکِ انضمام تو خود اس کی شہنشاہیت کے زمانے ہی میں اپنی موت مر گئی۔ کبیر کی تحریک البتہ آگے بڑھی۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اتحاد و ادغام کی یہ مصنوعی کوشش بالآخر انتشار کا باعث بنی اور اس سے ایک نئے مذہب اور اس کی بنا پر ایک نئی قوم وجود میں آ گئی اور وہ ہے سکھ قوم۔ اس سے بھی علامہ کے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے کہ تشکیل قومیت میں مذہب سب سے مؤثر عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

علامہ موصوف نے اپنے تصورِ قومیت کی روشنی میں برصغیر کے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ نسلی و وطنی احساسات پر مبنی تصوراتِ قومیت کی لعنت سے بچیں۔ کیونکہ ان احساسات سے وجود میں آنے والے تصورات براہِ راست تعلیمِ اسلامی سے متصادم ہوں گے اور ملتِ اسلامیہ کو قوم در قوم تقسیم کر کے تباہ کر دیں گے۔ انہوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ اسلام ایک ایسی زندہ و متحرک قوت ہے جو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں "غیر معمولی اصلیت" رکھتی ہے۔ اور نسل و وطن کے امتیازات سے آزاد کر کے تمام مسلمانوں کو متحد و منظم کر سکتی ہے۔[4] انہوں نے اپنے خطبہ الہ آباد میں فرمایا

---

[1] محولہ سید حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا، شعبہ تصنیف و تالیف ترجمہ، کراچی یونیورسٹی اگست ۱۹۷۰ء ص ۲۴۴

[2] خطباتِ اقبال، ص ۳۷

[3] پاکستان ناگزیر تھا، ص ۲۴۵، ۲۴۶

[4] خطباتِ اقبال، ص ۱۳۰، ۱۳۱

"ہم سات کروڑ ہیں اور ہندوستان کے باشندوں میں اپنی جمعیت کے اندر سب سے زیادہ باہم، یک جنس اور ہم عناصر ہم مسلمان ہی ہیں اور کوئی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں صرف ایک مسلمان ہی ایسے ہیں جن کو اس نفظ کے جدید ترین معنی میں قوم کہا جا سکتا ہے۔ ہندو اگرچہ ہر چیز میں ہم سے آگے ہیں مگر وہ یکسانیت اپنے اندر پیدا نہیں کر سکے جو ایک قوم کے لیے ضروری ہے اور جو اسلام نے آپ کو مفت تحفے کے طور پر عنایت کر دی ہے۔"[1] اپنے اسی تصور کی بنا پر علامہ موصوف نے اپنے اسی خطبے میں وہ مشہور سکیم پیش کی تھی جسے ہم "تصورِ پاکستان" سے موسوم کرتے ہیں۔ اس میں واضح طور سے تجویز کیا گیا تھا کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کو ایک اسلامی ریاست کی شکل دی جائے۔ یہ سکیم نہرو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کی گئی تھی مگر کمیٹی نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ کمیٹی نے اس تجویز کو کسی نظریاتی بنیاد پر رد نہ کیا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کمیٹی ہندو مسلم مسئلے کو بین الاقوامی مسئلہ تسلیم کرتی تھی۔ کمیٹی نے اس تجویز کو مسترد کرنے کے لیے بعض انتظامی دشواریوں کا عذر پیش کیا تھا۔ جن کو دور کرنے کے لیے مسلمانوں نے مؤثر تجاویز پیش کر دی تھیں۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے برصغیر پاک و ہند کے سیاسی پس منظر اور اپنے گہرے مطالعہ اسلام کی روشنی میں دینِ اسلام کو مسلمانوں کی قومیت کی اساس قرار دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "ہماری قوم کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن اور نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی۔ اس لیے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکے میں پہنچی ہیں وہ سب یکساں ہیں۔"[2]

ے نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

16

"لا الٰہ الا اللہ" کے زیرِ عنوان ایک اردو نظم میں اسی حقیقت کو باندازِ استعارہ یوں بیان کیا ہے۔

---

[1] پاکستان ناگزیر تھا، ص ۲۴۹

[2] محولہ محمد طاہر فاروقی و خاطر غزنوی، خیابانِ اقبال، یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور، ص ۱۷۰

؎ یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ[1]

اور ایک اور نظم میں جس کا عنوان "خطاب امرائے عرب سے" ہے اس کو یوں واضح کیا ہے۔

؎ نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربی سے ہے عالم عربی

اس طرح گویا علامہ نے وطنی بنیادوں پر ابھرنے والے عرب قومیت کے اس فتنے کے خلاف اس زمانے ہی میں صدائے احتجاج بلند کر دی جو بعد میں یہاں تک ترقی کر گیا کہ ابنائے اسلام فخریہ اپنے آپ کو ابنائے فرعون کہنے لگے۔ یہاں یہ ذکر مناسب ہو گا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے کسی نے ان کا حسب و نسب دریافت کیا تو انہوں نے برجستہ جواب دیا تھا کہ انا ابن الاسلام یعنی میں فرزند اسلام ہوں علامہ اقبال کے سامنے اسلامی قومیت کا یہی تصور تھا۔ ان کی آرزو تھی کہ مسلمانوں کا ہر فرد رنگ و خون کے امتیازات سے بالاتر ہو کر "انا ابن الاسلام" کہلانے کا جذبہ رکھتا ہو۔ چنانچہ ان کا ارشاد ہے:

"نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے۔ جس کی تشکیل اسی قانونِ الٰہی کے تابع ہو، جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب قبائل اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زبان، مکان، وطن، قوم نسل، نسب، ملک و رنگ سب بتوں کو توڑ کر ایک وحدت قومی کا نظریہ پیش کرے جس کی بنیاد اسلام اور صرف اسلام پر ہوتی ہے[2]

اقبال کا یہ تصور اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور ان کا کلام ان کے اس تصور کا ترجمان ہے۔ چنانچہ "جواب شکوہ" میں اس کو یوں پیش کیا گیا ہے ؎

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں مے خانے سے

---

[1] علامہ اقبال، ضرب کلیم، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، جون ۱۹۶۸ء ص ۹

[2] بحوالہ خیابانِ اقبال، ص ۱۶۹

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے [1]

"مردِ مسلمان" کے زیرِ عنوان نظم میں فرماتے ہیں :۔

ہمسایۂ جبریلِ امین بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں [2]

نظم "طلوعِ اسلام" میں یہ تصور اور بھی واضح ہو جاتا ہے، فرماتے ہیں :۔

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی، نہ افغانی [3]

اور پھر نصیحت کرتے ہیں :۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو   اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی   تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا [4]

جوابِ شکوہ میں قومیتِ اسلامی کے جذبے کو یوں مہمیز کیا گیا ہے :۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک   ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک   کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں [5]

---

[1] بانگِ درا، ص ۲۳۰

[2] ضربِ کلیم، ص ۵۷

[3] بانگِ درا، ص ۳۰۸

[4] بانگِ درا، ص ۳۱۲

[5] بانگِ درا، ص ۲۲۴

وطنی قومیت اور اقبال

علامہ اقبال کے تصورِ قومیت پر جو بحث اوپر گزری ہے اس کی روشنی میں قطعی انداز میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ کی فکر میں وطنی قومیت کے تصور کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ لیکن علامہ کے کلام میں بعض مقامات ایسے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ وطنی قومیت کے قائل تھے۔ بعض اقبالیوں نے اپنی معذرت خواہانہ تعبیروں میں علامہ کے ایسے اشعار کو حب الوطنی پر محمول کیا ہے اور بعض ناقدین اقبال کو اب تک یہ اصرار ہے کہ علامہ وطنی قومیت کے علمبردار تھے۔ یہ وہ نکتہ ہے جسے علامہ کے نظریہ قومیت کی بحث میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلے میں ہماری رائے یہ ہے کہ اوّل اوّل علامہ وطنی قومیت کے قائل تھے لیکن فکری ارتقا کے ساتھ ساتھ ان کے اس نظریے میں بھی تبدیلی آ گئی اور وہ قومیت کی وطنی اساس کے بجائے مذہبی بنیاد کے قائل ہو گئے۔

علامہ اقبال کے ۱۹۰۵ء تک کے کلام میں "ہمالہ" "ترانہ ہندی" اور "نیا شوالہ" جیسی وطنی نظمیں موجود ہیں۔ جن سے وطنیت یا وطنی قومیت کا تصور صاف جھلکتا ہے۔ مثلاً ترانہ ہندی میں فرماتے ہیں ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا[1]

ان اشعار کو محض حبُ الوطنی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً جب ان اشعار کو ان اشعار کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے جن کو علامہ نے اپنا مجموعہ کلام "بانگِ درا" مرتب کرتے وقت قلم زد کر دیا، لیکن کلیاتِ اقبال میں موجود ہیں تو عزیز احمد کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ علامہ اس زمانے میں وطنی اور نسلی قومیت کے قائل تھے۔ اور تشکیل قومیت میں مذہب کو مؤثر قوت تسلیم نہ کرتے تھے[2]۔ مثلاً ترانہ ہندی کے ساتھ ذرا ان اشعار کو ملا کر پڑھیے:

؎ ہم نے مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی — کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
رنگِ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں — خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں[3]

---

[1] بانگِ درا ، ص ۸۲

[2] عزیز احمد، اقبال۔ نئی تشکیل، گلوب پبلشرز لاہور ۱۹۶۸ء ، ص ۲۱

[3] محولہ ایضاً ، ص ۲۱

اسی طرح "نیا شوالہ" کا یہ شعر بانگِ درا میں موجود ہے:-

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے[۱]

اس شعر میں وطن پرستی — وطن دوستی نہیں — وطن پرستی کی جھلک نمایاں ہے۔ لیکن کلیاتِ اقبال[۲] ص ۵۰-۵۱ میں اس سے بھی واضح اشعار موجود ہیں۔ جن سے وطنیت صاف مترشح ہوتی ہے مثلاً

زنّار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں

یہ وہی تصوّر ہے جو اکبر نے پیش کیا تھا، جس کا کبیر نے پرچار کیا تھا اور جسے کانگرس نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی کی بنیاد بنایا تھا اور جس کا مطلب یہ تھا کہ ہندو، مسلمان مذہبی اختلاف کے باوجود اشتراکِ وطن کی وجہ سے ایک قوم ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تصوّر اقبال کے اس نظریے سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا جس کی اُوپر وضاحت کی گئی ہے۔

20

۱۹۰۵ — ۰۶ء کے برصغیر پاکستان و ہند پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندو مسلمان آزادیٔ وطن کے لیے مشترکہ جدوجہد میں مصروف تھے اور تحریکِ آزادی کے رہنما ان میں اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں بلکہ حربے استعمال کر رہے تھے۔ انگریز سے نفرت کا جذبہ اس قدر شدّت اختیار کر گیا تھا کہ بڑے بڑے ثقہ علمائے اسلام اس قسم کی باتیں کہہ جاتے تھے۔ کہ میں اس خنزیر کا منہ چومنے کو تیار ہوں جو انگریز کا دشمن ہو۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق خنزیر نجس العین ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ علامہ مرحوم بھی اس فضا سے متاثر ہوئے اور جذبہ آزادیٔ وطن کے زیرِ اثر انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی مذہبی اختلاف کو بھی نظر انداز کر دیا لیکن دونوں قوموں کے نہاں خانۂ دماغ میں یہ اختلاف ہمیشہ محفوظ رہا۔ اور اس کا ایک اظہار انیسویں صدی کے اواخر میں اس وقت ہوا جب سرسیّد کی اُردو یونیورسٹی کی تجویز کے مقابلے میں ہندوؤں نے ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا سوال کھڑا کر دیا تھا[۳]۔ مسلمان بھی ہندوؤں کے بغض و تعصب سے باخبر تھے اور بالآخر ۱۹۰۶ء کے آخری روز انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے اپنی علیحدہ تنظیم قائم کر لی اور اس کے ساتھ ہی ہندو مسلم جداگانہ قومیت

---

[۱] بانگِ درا، ص ۸۸ [۲] محولہ اقبال — نئی تشکیل، ص ۲۱

[۳] منور ابن صادق "اُردو اور تحریکِ پاکستان" ہفت روزہ آئین، لاہور، ۱۳ اپریل ۱۹۶۷ء، ص ۴ - ۱۵

کا نظریہ قوت سے فعل میں آگیا۔ اور اب علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اس کے سب سے بڑے مبلغ تھے اور ان کا سب سے بڑا ہدف نظریۂ وطنیت تھا۔

اب علامہ موصوف وطنی قومیت کے بجائے اسلامی قومیت کے علمبردار تھے اور وہی شاعر جس نے "ترانۂ ہندی" میں کبھی یہ کہا تھا کہ "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" اب "ترانۂ ملّی" کے نام سے برملا اعلان کرتا ہے

؎ چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا   مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا   اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا[۱]

اب علامہ کو یہ گوارا نہیں کہ مسلمان کسی نسلی، علاقائی یا لسانی بنیاد پر قوم در قوم تقسیم ہوں یا کسی دوسری قوم میں ضم ہو کر اپنا تشخص کھو دیں۔ جہاں کہیں ایسی کوئی تحریک یا سازش نظر آتی تھی، علامہ تڑپ اٹھتے تھے۔ بانگِ درا کے ایک قطعے میں ایسی ہی ایک تڑپ کا اظہار ہوا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو

؎ کل ایک شوریدہ سرِ خواب گاہِ نبی پر رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملّت مٹا رہے ہیں[۲]

اس صورتِ حال میں بھی علامہ ہمیشہ پُرامید رہے کہ مسلمان بالآخر متحد و منظم ہوں گے اور توحیدِ اسلامی کی بناء پر اپنی تحریک کو آگے بڑھائیں گے۔ چنانچہ "شمع اور شاعر" میں بزبانِ شمع فرماتے ہیں :

21

؎ آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گُل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی[۳]

؎ شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے[۴]

غرض یہ کہ اب علامہ اقبال وطنیت کے مخالف تھے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اب انہیں آزادیٔ ہند سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ نظریۂ قومیت کے سلسلے میں تبدیلیٔ تصور کے باوجود علامہ آزادیٔ ہند کے علمبردار رہے۔ چنانچہ اپنے خطبہ الہ آباد میں انہوں نے واضح کیا تھا کہ دو قومی نظریے کے باوجود ہندو اور مسلمان

---

[۱] بانگِ درا، ص ۱۷۲، ۱۷۳
[۲] بانگِ درا، ص ۲۰۳
[۳] بانگِ درا، ص ۲۱۵
[۴] بانگِ درا، ص ۲۱۶

دونوں قومیں آزادیٔ وطن کے لیے مشترکہ جدوجہد جاری رکھ سکتی ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی طرف سے پیشکش کی تھی کہ اگر اُن کی جداگانہ قومیت اور اس کی بناء پر متعلقہ حقوق کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ آزادیٔ وطن کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں[1]۔

نظریہ قومیت کی بحث علامہ اقبال کی زندگی کے آخری دنوں تک جاری رہی لہٰذا اس موضوع پر علامہ اقبال کے تمام افکار منظرِ عام پر آ گئے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جغرافیائی اصطلاح کے طور پر علامہ کو وطن پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن ایک سیاسی اصطلاح اور سیاسی تصوّر کے طور سے، قومیت کی اساس کے طور سے، وہ اسے براہ راست اسلامی نظریہ حیات سے متصادم تصوّر کرتے تھے۔ انہوں نے اسوۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے تصوّر وطنیت کے غیر اسلامی ہونے پر استدلال کیا اور فرمایا کہ "ابوجہل اور ابولہب سے اشتراکِ وطنیت کے باوجود آپؐ نے مصالحت و مفاہمت نہ کی حالانکہ آپ کہہ سکتے تھے کہ تم اپنی بُت پرستی پر قائم رہو۔ ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں، مگر نسلی اور وطنی اشتراکیت کی بناء پر جو ہمارے تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدت عربیہ قائم ہو سکتی ہے[2]۔"

اسی طرح انہوں نے ہجرت نبوی سے بھی وطنی قومیت کے تصوّر کے خلاف استدلال کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی ‏ ‏ رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی ‏ ‏ دے تو بھی نبوّت کی صداقت کی گواہی

گُفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے[3]

22

گویا علاّمہ کو وطن اور وطنیت کے سیاسی تصوّر سے اختلاف تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ایک نظم "وطن (یعنی وطنیت بحیثیت ایک سیاسی تصوّر کے)" میں اس کی یوں وضاحت کی ہے:۔

اس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ‏ ‏ ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مُسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور ‏ ‏ تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

---

[1] خطباتِ اقبال، ص ۳۵ ‏ [2] خیابانِ اقبال، ص ۱۶۶ ‏ [3] بانگِ درا، ص ۱۷۳

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے　　غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے　　اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی! خاک میں اس بُت کو ملا دے[1]

علاّمہ اقبال کے ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے تصوّرِ وطن کو دین اسلام سے متصادم تصوّر کرتے تھے۔ مزید برآں انہوں نے اس تصور اور اس کے ان عملی مضمرات کو بھی بھانپ لیا تھا جن سے وحدت اسلامی کے پارہ پارہ ہونے کا خطرہ تھا۔ انہوں نے اپنے اس اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں زندگی کے نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے[2] اس طرح وطنی قومیت کی بنیاد پر مسلمانوں کے مختلف اقوام میں بٹ جانے کا خدشہ تھا۔ جب عرب مسلمانوں نے ترک مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کو مدد دی تو علاّمہ کا یہ خدشہ درست ثابت ہوگیا۔ علامہ قومیت اسلام کے علمبردار تھے اور مغرب کے تصوّرِ وطنیت کو قومیت اسلام اور اتحاد عالم اسلام کے خلاف ایک سازش سمجھتے تھے۔ لہٰذا اس تصوّر کے خلاف ان کا لہجہ بڑا سخت ہے عبدالستار پراچہ (لیکچرار شعبہ اُردو پشاور یونیورسٹی) نے علامہ کے نظریہ سیاست پر بحث کرتے ہوئے تصوّرِ وطنیت کے متعلق ان کی مخالفت کی درج ذیل وجوہات کی نشاندہی کی ہے :-

۱۔ یہ خالص مادہ پرستانہ تصوّر ہے۔ یہ کلیسا کے خلاف معاندانہ ردِ عمل ہے اور اس سے خدا بیزاری کا رجحان بڑھتا ہے۔

۲۔ اس سے مذہب اجتماعی زندگی سے خارج ہوگیا اور اس کی جگہ وطن نے لے لی۔ اس سے وطن خدا ہوگیا اور انسان غلام۔

۳۔ اس تصوّر نے اولاد آدم کو جغرافیائی حدود میں مقید کر کے ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا۔ وطن کی بنیاد پر انسانیت کی تقسیم کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ انسان انسان نہیں رہتا۔ وہ جرمن، انگریز، امریکن اور جاپانی بن کے رہ جاتا ہے۔[3]

---

[1] بانگِ درا ، ص ۱۷۴　　[2] محولہ خیابان اقبال ، ص ۱۶۶؛

[3] محولہ خیابان اقبال ، ص ۱۸۳ تا ۱۸۵

علامہ اقبال کے کلام میں جابجا تصوّرِ قومیت کے ان خطرناک نتائج کا ذکر موجود ہے ۔ مثلاً

ے آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند ‏ ‏ ‏ بر وطن تعمیرِ ملّت کردہ اند

ے اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے ‏ ‏ ‏ قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

خالص جغرافیائی معنوں میں علامہ اقبال کو وطن کی اصطلاح پر کوئی اعتراض نہ تھا ۔ ان معنوں میں ہندی یا عربی یا ترکی کہلانے کو وہ جائز سمجھتے تھے ۔ لیکن اس نسبت کو قومیت جیسے اہم جذبے کے لیے مؤثر قرار دینے کے وہ سخت خلاف تھے خصوصاً قومیتِ اسلام کے لیے وہ کسی علاقے کی حد بندی کو تسلیم نہیں کرتے ۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ سورج کو مشرق کی طرف سے طلوع ہونے کی وجہ سے "مشرقی" یا "خاوری" کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے باوجود وہ مشرق سے مغرب تک آفاق کو جگمگا دیتا ہے ۔ یہی صورت مسلمان کی ہے ۔ وہ مشرقی ہو یا مغربی ، عربی ہو یا عجمی ، بہرحال وہ عالمگیر اسلامی قومیت کے رشتے سے منسلک ہے ۔

ے اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر ‏ ‏ ‏ خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار ‏ ‏ ‏ قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں ‏ ‏ ‏ اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

ے درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند 24

وطنی قومیت کے سلسلے میں "ارمغانِ حجاز" کا وہ قطعہ بڑا مشہور ہے جس میں علامہ نے اس زمانے کے کانگرسی شیخ الاسلام کے اس قول کی تردید کی تھی کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں ۔ علامہ فرماتے ہیں :-

ے سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است ‏ ‏ ‏ چہ بے خبر ز مقامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ‏ ‏ ‏ اگر براو نرسیدی تمام بولہبی است[1]

ارمغانِ حجاز علامہ کے آخری دور کا مجموعۂ کلام ہے ۔ اس کی اشاعت پر وطنیت کی بحث ایک دفعہ پھر تازہ ہو گئی ۔ اس موقعہ پر علامہ نے ایک بیان کے ذریعے ایک دفعہ پھر وطنیت کے متعلق اپنے موقف کی وضاحت کی کہ جغرافیائی حیثیت سے وطن کا تصوّر اسلام کے خلاف نہیں لیکن ایک سیاسی تصوّر کے اعتبار سے یہ اسلام سے متصادم ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

---

[1] علامہ اقبال ، ارمغانِ حجاز ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۶ء ص ۲۷۸

"........ مولانا کا یہ ارشاد کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں، قابلِ اعتراض نہیں۔ اس لیے کہ قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں ..... وطن کا لفظ جو اس قول میں استعمال ہوا ہے۔ محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا، اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصوّر ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے۔ اس لیے جب لفظ وطن کو ایک سیاسی تصوّر کے طور سے استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہو جاتا ہے .... یہ اسلام ہی تھا جس نے سب سے پہلے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ، بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔"[1]

یہ طویل اقتباس گویا علّامہ کے پورے تصورِ قومیت، وطنیت کا خلاصہ ہے۔ میں اپنی گزارشات کو علّامہ کے اس ارشاد پر ختم کرتا ہوں جس میں مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد ۱۹۳۰ء کے موقع پر انھوں نے مسلمانوں کو متحد ہونے کی تلقین کی تھی۔ فرماتے ہیں :۔

25

"ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے یہ ہے کہ صرف اسلام ہی تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جمادیں اور اس کے زندگی بخش تخیّل سے متاثر ہوں۔ تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت اور بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔"[2]

پنجابی، بلوچی، سندھی، پشتو، براہوی، گجراتی، ہندکو، پھوٹھواری، سرائیکی اور ہریانی کے نام پر اٹھنے والی لسانی تحریکوں کے آشوب میں مبتلا اہلِ پاکستان کو علامہ اقبال کا یہ پیغام سامنے رکھنا چاہیے اور مشرقی پاکستان کے سقوط سے عبرت حاصل کرتے ہوئے علاقائی، لسانی اور نسلی تعصبات سے احتراز کرنا چاہیئے۔

---

[1] اقبال — نئی تشکیل، ص ۱۴۹، ۱۵۰۔ [2] خطباتِ اقبال، ص ٦٣، ٦٤